

فاقہ میں روزہ

(تاج دار دہلی کے ایک کنبے کا فسانہ)



یہ سبق پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:

- مضمون نویسی کے مختلف انداز تحریر (بیانیہ، مدلل، بجشی، تفصیلی اور تحقیقی و تنقیدی) کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف موضوعات کو قلم بند کر سکیں۔
- اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی امور وغیرہ سے متعلق اپنی گفتگو میں موزوں الفاظ و تراکیب پر مشتمل روزمرہ اور با محاورہ زبان استعمال کر سکیں۔
- مختلف سبکی ذرائع سے کہانی، نظم، واقعہ، تقریر، اعلان، خطبہ، گفتگو، خبر، ڈراما، ہدایت اور فہر وغیرہ نمونہ کر احساس، جذبے اور تاثر کے حوالے سے زبان کے حسن و قبح کی نشان دہی کر سکیں۔
- مباحثوں، مذاکروں، سیمیناروں میں حصہ لیتے ہوئے کسی موضوع کے حق یا مخالفت میں دلائل اور آداب کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کر سکیں۔
- اپنی جماعت کے معیار کے مطابق روزمرہ، ضرب الامثال اور محاورات کا استعمال کرتے ہوئے سادہ اور مرکب جملے تحریر کر سکیں۔
- الفاظ و معانی سے واقفیت اور ان کے انتخاب میں لغت اور تھیسارس کا استعمال کر سکیں اور درست تلفظ کی فہم کے لیے اعراب کا استعمال کریں۔
- رپورٹ، تاثر، تجزیاتی رپورٹ اور یادداشت کے درمیان فرق کو سمجھتے ہوئے ان کی تحریری تخلیق کر سکیں۔
- منظوم یا منثور کسی بھی دو اصناف ادب یا اقتباسات کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے تبصرہ کر سکیں۔

پڑھیں



جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی، لال قلعہ پر تیوریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابو ظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر میں مغوم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا: ”خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔“ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا:

”نہیں کچھ نہیں بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت نتھن خاں گویا گارہا تھا اور میرادل بہلارہا تھا۔ اس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں، ان کو یہ شور و غل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان بھر گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا مگر اس کی پابندی سے جی الجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ سولہ دن کیوں کر بسر ہوں گے۔“

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا:

”حضور یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے۔ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد میں تشریف لے چلا کیجیے عجب بہار ہوتی ہے۔ رنگ برنگ کے آدمی، طرح طرح کے جگمگے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار دیکھیے۔“

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے دور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی گروہ میں بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے۔ کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

کُلُّ جَدِيدٍ لَذِيذٌ مرزا کو یہ نظارہ بہت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا۔ سینکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محل سلطانی سے متعدد خوان مکلف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے تاکہ روزہ داروں میں افطاری تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امرا علیحدہ افطاری کا سامان بھیجتے تھے اس لیے ان خوانوں کی گنتی سینکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چوں کہ ہر امیر کوشش کرتا تھا کہ اس کا سامان افطاری دوسروں سے بڑھ کر رہے، اس لیے ریشمی رنگ برنگ کے خوان پوش اور ان پر مقیشی جھالریں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہو جاتی تھی۔

مرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان شوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھروں میں وہ دیکھتے کہ سینکڑوں فقرا کو سحری اور اول شب کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوا یا جاتا تھا اور باوجود رات، دن کے لہو و لعب کے یہ دن ان کے گھر میں بڑی برکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نو عمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خواب و خیال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیرِ زبر ہو گئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا۔ امیروں کو پھانسیاں مل گئیں۔ ان کے گھر اکھڑ گئے۔ ان کی بیگمات ماما گیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان و شوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہ جہاں کی خوب صورت اور بے مثال مسجد، اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد و گزاشت ہو گئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا کہ چند مسلمان میلے کیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیئے، کسی نے ترکاری کے تیلے تقسیم کر دیئے۔ نہ وہ اگلا سا سماں نہ وہ اگلی سی چہل پہل نہ وہ پہلی سی شان و شوکت، یہ معلوم ہوتا تھا کہ بے چارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غربائے توان سے رونق کیا خاک ہو سکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد رہے۔ اگر مسلمانوں کے افلاس کا یہی عالم رہا تو آئندہ خبر نہیں کیا نوبت آئے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے غدر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سنا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اس کے بیان کرنے میں عذرو مجبوری کرنے لگے۔ لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی۔

”جب انگریزی توپوں نے، کرچوں اور سنگینوں نے، حکیمانہ توڑ جوڑنے، ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ تاج سر سے اتار لیا۔ تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتش ناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے بن باپ کے بچے بااں پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور قل سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کسمن بہن اور بیمار بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔“

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے اس لیے شاہد رہے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھترپور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل، تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی ایک بڑھاپے سے لاچار، دو قدم چلنا دشوار، دوسری بیمار، تیسری دس برس کی معصوم لڑکی زار و نزار۔ عورتیں روتی تھیں اور بیان کر کے روتی تھیں۔ میرا کلیجہ ان کے بیان سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں الٹی ہم کہاں جائیں، کس کا سہارا ڈھونڈیں، ہمارا تاج و تخت لٹ گیا تو ٹونا بوری اور امن کو جگہ تو دے۔ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں، جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں، کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منہ نکلتی تھی۔ مجھ کو اس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ یہ کہتیں:

”تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلاتی ہے جو تاج و زور کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کر دیا جو بے کسوں کے کام آتے تھے۔ ہم جنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کاٹتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہر یاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہ جہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھادی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے آج ہم پر آسمان روتا ہے۔“

تو بدن پر روٹنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ القصد یہ ہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں میواتیوں کا تھا۔ انھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنے چوپال میں ہم کو ٹھہرایا۔

کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپال میں ہم کو ٹھہرائے رکھا لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے، اکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی! چوپال میں ایک بار ات آنے والی ہے تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی (بے کار) بیٹھے کیا کرے ہے، کچھ کام کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کہا: ”بھائی جہاں تم کہو گے وہیں جاؤں گے، ہمیں چوپال میں رہنے کی ہوس نہیں جب فلک نے عالی شان محل چھین لیے تو اس کے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے، خالی بیٹھے ہوئے طبیعت اکتائی جاتی ہے، مجھ کو کوئی کام ہٹاؤ۔ ہو سکے تو آنکھوں سے کروں گا۔“

ان کا چودھری بولا: ”ہم نے کے بیرا کہ تو کے کام کر سکے ہے۔“ (ہم کو کیا پتہ کہ تو کیا کام کر سکتا ہے)

میں نے جواب دیا: ”میں سپاہی زادہ تیغ تفنگ چلانا میرا ہنر ہے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔“

گنوار ہنس کر کہنے لگے: ”نہ بابا یہاں تو بل چلانا ہو گا، گھاس کھودنی پڑے گی، ہم نے تلواریں کے ہنر کیا کرنے ہیں۔“

گنواروں کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور جواب دیا کہ

”بھائیو مجھ کو تو بل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔“

مجھ کو روٹا دیکھ کر گنواروں کو رحم آگیا اور بولے:

”اچھا تو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کو کافی ہو گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینہ آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا، میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دیا۔ وہ گاؤں وہاں دو اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہو گیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چوں کہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا۔ اس لیے ہماری عورتوں کی چار پائیاں بالکل غرق آب ہو گئیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بیلیوں میں دو چار پائیاں اڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اتر گیا مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے درد شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بخار بھی آیا۔ اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ، مینہ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے، آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے الٹی کیا انتظام کیا جائے۔ درد بڑھنا شروع ہوا اور مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ یہاں تک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔

چوں کہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں، غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی مگر یہ بعد کا جھکا ایسا بڑا لگا کہ جان لے کر گیا۔ صبح ہو گئی، گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوادیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گور غریباں میں ہمیشہ کے لیے جاسوئی۔

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیوں کہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔ تاہم بے چارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپے کا آٹا منگوادیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہو گا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا، وہ ہر وقت گزشتہ زمانے کو یاد کیا کرتی تھیں، رمضان کا چاند دیکھ کر انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو اگلا وقت یاد آ گیا ہے۔ تسلی کی باتیں کرنے لگا جس سے ان کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے مگر جب آٹا ختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا، بھوک کے مارے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کر کے رویا کرتی تھیں مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ ان کی خاموشی و اطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں، دلاسا دینے لگا وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہو کر چار پائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے بس ایک غوطہ سا تھا۔

اس غوطے اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آ گیا۔ والدہ صاحبہ انھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں انھوں نے دعا مانگی اور ان کا نقل کرنا محال ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بارگاہ الہی میں عرض کیا: ”ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے گھر سے سینکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزے پر روزہ رکھتے ہیں۔ خداوند! اگر ہم سے قصور ہوا ہے تو اس معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے منہ میں کل سے ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی۔“

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقے میں روزے پر روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور بیٹھے چاول لایا اور بولا: آج ہمارے نیاز تھی، یہ اس کا کھانا ہے اور پانچ روپے زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں مگر اب کے نقد دے دیا ہے۔

یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئی گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکر انا بھیجتا جاتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردش افلاک نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیم غیرت داری پر قائم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ باوجود فاقے کی ناتوانی کے انھوں نے تیور بدل کر کہا: ”تف ہے تیری غیرت پر، خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ ارے اس سے مر جانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مر جانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے، صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔“

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینہ آ گیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ چاہا کہ اٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں مگر والدہ نے روکا اور کہا: ”خدا ہی کو یہ منظور تو ہے ہم کیا کریں سب کچھ سہنا ہو گا۔ یہ کہہ کر کھانا کھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھالیا۔ پانچ روپے کا آنا منگوا لیا جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہو گیا۔“

اس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں اور رہے پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا انتقال ہو گیا اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

(۱۸۵۷ء)

خواجہ حسن نظامی بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ سید عاشق علی حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے وابستہ تھے۔ بارہ سال کے تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ابتدائی زندگی بڑی تنگ دستی میں گزری۔ کتابیں بیچنے کا کاروبار شروع کیا۔ فرصت کے اوقات میں لکھنے لکھانے کا کام کرتے، رفتہ رفتہ ان کے مضامین رسالوں اور اخباروں میں چھپنے لگے۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ”رعیت“ سے ہوا۔ اخبار ”منادی“ میں ان کا روزنامہ شائع ہوتا رہا۔ خود بھی میرٹھ سے ایک اخبار ”توحید“ نکالا۔

اردو ادب میں خواجہ حسن نظامی منفرد اسلوب نثر کے اعتبار سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جو انھوں نے ۱۸۷۸ء میں مغلیہ خاندان پر گزرنے والی دردناک مصیبتوں کے سلسلے میں لکھے اور دوسرے ادبی، اخلاقی اور صوفیانہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ مضامین اسلوب اور انداز فکر کی دل کشی کی وجہ سے انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

خواجہ حسن نظامی کی زبان دہلی کی کسائی زبان ہے۔ عبارت میں صفائی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ انھیں دہلی کے محاورہ اور روزمرہ پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں میں بے تکلفی اور بے ساختگی ہے۔ ان کے جملے چھوٹے اور دل پر اثر کرنے والے ہوتے ہیں، ان کے ہاں ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی عام استعمال ہے لیکن عبارت کی روانی اور سلاست میں ذرا فرق نہیں آتا۔ آپ کا انداز ایک کھلا ذہن کھلا دل اور وسیع الشرب نقطہ نظر رکھنے والے صوفی کا سا ہے جو ان کی ہر تحریر میں جھلکتا ہے۔

تصانیف: بیگمات کے آنسو، انگریزوں کی ہمتا، غور کا فرمان، غالب کا روزنامہ، غدر، غدر کی صبح شام، دہلی کی آخری شمع، سپہا کا دل، سفر نامہ حجاز مصر و شام، محرم نامہ، جنگ بیتی کہانیاں، میلاد نامہ، مجموعہ خطوط حسن نظامی، توپ خانہ وغیرہ

مشق



۱۔ درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔

الف۔ مرزا سلیم رمضان شریف میں محفلیں سجاتے تھے:

الف۔ گانے بجانے کی ب۔ نعت خوانی کی
ب۔ مرزا شہ زور کی والدہ مرزا سلیم کی تھیں:

الف۔ بہن ب۔ بھابھی
ج۔ مصاحب کے کہنے پر مرزا سلیم جانے لگے:

الف۔ قطب صاحب ب۔ تاج محل
ج۔ مقبرہ ہمایوں د۔ جامع مسجد

د۔ انگریز سرکار نے مرزا سلیم کی پیشن مقرر کی:

الف۔ پانچ روپے ب۔ سات روپے ج۔ دس روپے د۔ بارہ روپے

۲۔ مضمون نویسی کے مختلف انداز تحریر کو مد نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل موضوعات کو قلم بند کریں۔

الف۔ مسئلہ کشمیر

ب۔ سائنس اور ٹیکنالوجی۔

ج۔ سوشل میڈیا کے آداب

۳۔ سبق 'فاقہ' میں روزہ پڑھ کر اس میں موجود مندرجہ ذیل موضوعات کی شناخت کرتے ہوئے مصنف اور قارئین کے نقطہ نظر کے ساتھ اس کی وضاحت کے لیے اپنی رائے کا اظہار کریں اور انھیں اپنی روزمرہ اور با محاورہ زبان میں استعمال بھی کریں۔

الف۔ ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی کے حالات

ب۔ مسجد کی رونقیں اور عبادت گزاروں کے لیے کھانے کا بندوبست

ج۔ مرزا سلیم حیدر کے شب و روز

د۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسجد کی دیگر گوں صورت حال

ہ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے معاشی حالات

و۔ مغلیہ شہزادوں، شہزادیوں کی در بدری اور کس مہر پر سی

۴۔ ”آئین پاکستان اور حقوق انسانی“ کے موضوع پر اپنے کالج میں ایک سیمینار یا مباحثہ منعقد کریں۔ موضوع کے حق یا مخالفت میں دلائل اور آداب کے ساتھ اپنا نقطہ نظر بھی پیش کریں۔

۵۔ سبق 'مکاتیب غالب' اور 'فاقہ' میں روزہ آپ نے پڑھا۔ دونوں مختلف اصناف ادب ہیں۔ آپ دہلی کے حالات کے بیان کے حوالے سے دونوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے تبصرہ کریں۔

(اصناف، موضوعات، پیش کش، ادبی محاسن، مصنف کا نقطہ نظر، زبان و بیان کا انتخاب اور قارئین پر اثرات کے لحاظ سے)

۶۔ سبق کے متن میں شامل درج ذیل الفاظ و تراکیب، محاورات، ضرب الامثال، مترادفات اور مرکبات پر مشتمل فقرات سمجھ کر پڑھیں اور انھیں بر محل استعمال کرنے کی مشق کریں۔

الف۔ خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔

ب۔ جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی۔

ج۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار دیکھیے۔

د۔ کل جدید لذیذ

ہ۔ تقدیر ان کو ٹھو کریں کھلاتی ہے جو تاج وروں کو ٹھو کریں مارتے تھے۔

و۔ آج ہم پر مصیبت ہے، آج آسمان ہم پر روتا ہے۔

ی۔ ”ہم نے کے ہیرا کہ تو کے کام کر سکے ہے“

۷۔ 'پاکستان میں ڈینگلی بخار کے پھیلاؤ اور اس سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر' کے حوالے سے ایک رپورٹ یا تجزیاتی رپورٹ کی تحریر کی تخلیق کریں اور اسے مقامی اخبار میں اشاعت کے لیے بھیجیں تاکہ عوامی آگاہی کے حوالے سے ذمہ داری نبھائی جاسکے۔

۸۔ لغت اور تھیسارس کا استعمال

اُردو زبان و ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے بہت سے ایسے الفاظ آتے ہیں جو ہمارے لیے غیر مانوس ہوتے ہیں اور ہم نہ صرف ان کے معانی اور مطالب سے واقف نہیں ہوتے بلکہ اس بات سے بھی بے خبر ہوتے ہیں کہ ان الفاظ کی اصل کیا ہے اور وہ کہاں سے اور کس زبان سے آئے ہیں اور اُردو میں آکر انھوں نے کیا شکل اختیار کی ہے؟ اسی طرح ان کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں اور ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ جاننے کے لیے لغت کا سہارا لیا جاتا ہے۔

تھیسارس لفظوں کا ارتقا بیان کرتا ہے۔ تھیسارس یونانی زبان سے انگریزی میں آیا ہے اور اس کا مطلب ہے ذخیرہ یا خزانہ۔ بعد میں یہ لفظ خزینہ الفاظ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ تھیسارس ہمیں مختلف موضوعات اور تصورات کے بارے میں مناسب لفظوں کی فہرست مہیا کرتا ہے۔ مثلاً اگر ہم سڑک کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں تو تھیسارس ہمیں اس طرح کے الفاظ مہیا کرے گا: پگ ڈنڈی، راہ، راستہ، شاہراہ، خیابان، ہائی وے، روڈ، ذیلی سڑک وغیرہ وغیرہ۔

♦ درج ذیل الفاظ کے معانی سے واقفیت کے لیے تھیسارس اور لغت کا استعمال کرتے ہوئے معانی لکھیے اور ان الفاظ کے درست تلفظ کے فہم کے لیے ان پر اعراب بھی لگائیں۔

عذر، مغفوم، جھگڑنا، صلاح، مراقبہ، مکلف، واگزارشت، لشکر، کم سن، چھپر



مختلف سمعی ذرائع سے کہانی، نظم، واقعہ، تقریر، اعلان، خطبہ، گفت گو، خبر، ڈرامہ، ہدایت اور فیچر وغیرہ سن کر احساس، جذبے اور تاثر کے حوالے سے زبان کے حسن و قبح کی نشان دہی کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام

- طلبہ کو مختلف سمعی ذرائع سے کہانی، نظم، واقعہ، تقریر، اعلان، خطبہ، گفت گو، خبر، ڈرامہ، ہدایت اور فیچر وغیرہ سن کر احساس، جذبے اور تاثر کے حوالے سے زبان کے حسن و قبح کی نشان دہی کرنے کی مشق کروائیں۔

